

قانون اسلامی کی تدوین

انرجناب مولانا امین احسن صاحب، ضلحا

جو لوگ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے مخالف ہیں اس کے خلاف جہاں اور اعتراضات اٹھاتے ہیں، وہاں ایک اعتراض یہ بھی اٹھاتے ہیں کہ اسلامی قانون مروجہ ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی کی طرح مدون صورت میں موجود نہیں ہے، بلکہ نہایت منتشر اور غیر مرتب حالت میں ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام بے شبہ موجود ہیں لیکن ان کی توجیہ و تاویل میں بے شمار اختلافات ہیں۔ احادیث میں قوانین کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن ایک طرف تو ان میں تاویل و توجیہ کے اختلافات ہیں۔ دوسری طرف ان کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرنا ایک بہت بڑا معرکہ ہے۔ قانون اسلامی کا سب سے بڑا سرمایہ فقہ اسلامی کی کتابوں میں ہے لیکن یہ سب سے زیادہ منتشر حالت میں ہے۔ اول تو ہمارے ہاں مختلف فرقے ہیں۔ اور ان کی الگ الگ فقہیں ہیں۔ کوئی ایک ہی فقہ نہیں ہے کہ اس کو اختیار کر لیا جائے اور مسئلہ حل ہو جائے۔ بلکہ متعدد فقہیں ہیں جن میں سے کسی ایک فقہ کو بھی اختیار کرنا دوسری فقہوں کے حامیوں سے لڑائی مول لینا ہے۔ ثانیاً ان میں سے کوئی فقہ بھی ایک ضابطہ قانون کی صورت میں مدون نہیں ہے کہ اس کو اختیار کر کے ملک میں نافذ کیا جاسکے اور عدالتیں اس کے مطابق معاملات کے فیصلے کر سکیں۔ ہر فقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں جن کے سبب سے اس کا ایک ضابطہ قانونی کی شکل متبہل کرنا نہایت دشوار امر ہے۔ مثال کے طور پر فقہ حنفی کو لیجئے۔ یہ باوجودیکہ مدتوں ایک وسیع اسلامی دنیا میں جاری رہا ہے مگر بہت بڑی حد تک منجمد بھی ہو چکی ہے تاہم دیکھیے اس میں کتنے اہم اختلافات ہیں۔ اس میں کتنے مسائل ہیں جن میں خود امام صاحب کے فتوے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کتنے مسائل ہیں جن میں فقہ حنفی کے دوسرے اساطین مثلاً قاضی ابویوسفؒ اور امام محمدؒ اپنے امام سے مختلف مذہب رکھتے ہیں۔ کتنے مسائل ہیں جن میں متاخرین کے فتوے متقدمین کے فتووں سے الگ ہیں۔ اس طرح کے

گو ناگوں اختلافات ہیں جو ایک ہی فقہ کے اندر پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہماری مختلف فقہوں میں سے کسی فقہ کو بھی ملک کے لئے ایک ضابطہ قانون کی حیثیت سے اپنایا جاسکے۔

معتزین اس اختلاف انتشار کو ثبوت میں پیش کر کے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر آج کی عدالتوں کو در آنحالیکہ کوئی مدون ضابطہ قانون اسلامی کاموجود نہیں ہے۔ براہ راست کتاب و سنت سے اجتہاد کرنے کا وہ اختیار ہے دیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریحؓ کو دیا تھا تو لازمی طور پر اس کے دو نتیجے سامنے آئیں گے۔ ایک تو یہ کہ عدالتیں بالکل من مانے فیصلے کریں گی جن کو کتاب و سنت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہیں گی۔ تو اپنے زورِ اجتہاد سے یا اسلامی فقہ کے دینے ذخیرہ میں سے کوئی نہ کوئی بات اپنے مطلب کی ڈھونڈ بھی نکالیں گی۔ دوسرا یہ کہ حجوں اور تقاضیوں کو درگزرہ ایمان داری برتنا چاہیں گے، ایک سخت جبرانی و پریشانی سے سانبستہ پڑے گا۔ کیونکہ ہر معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت ان کو کسی مدون ضابطہ کے بجائے ایک منتشر ذخیرہ معلومات سے رہنمائی حاصل کرنی پڑے گی۔ اور یہ کام نہ صرف یہ کہ نہایت مشکل ہے بلکہ اس طرح سے عدالتی نظام کا ہماری اور یکسانی کے ساتھ کام کرنا تقریباً محال ہے۔

اسلامی قانون کے مدون صورت میں موجود نہ ہونے کی بنا پر تو معتزین مذکورہ بالا اعتراضات کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کو مدون کرنے کی تحریک کی جائے۔ تو مختلف مذہبی اور غیر مذہبی جماعتیں اس پر بھی طرح طرح کے شبہات وارد کرتی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان شبہات کا بھی ہم یہاں مختصر آئندہ ذکر کریں تاکہ معاملہ کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے۔

یہ گروہ مندرجہ ذیل شبہات پیش کرتے ہیں:-

تدوین قانون اسلامی پہلا شبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں جو وسعت ہے وہ اس ضابطہ بندی اور تدوین پر بعض شبہات سے بالکل ساڑ کر رہ جائے گی۔ عدالتیں پابند ہو جائیں گی کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ اس ضابطہ کی روشنی میں کریں جو ان کے سامنے بنا کر رکھ دیا گیا ہے خواہ انصاف اور شریعت الہی کا منشاء پرور ہو یا نہ ہو۔ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ بچوں کو کتاب و سنت کے سوا

کسی اور شے کا پابند کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن بھیجا تو فیصلہ معاملات کے مسئلہ میں کتاب و سنت کی پابندی کے ماسوا کسی اور چیز کی پابندی ان پر عائد نہیں فرمائی۔ پھر کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اسلامی عدالتوں کے ججوں اور قاضیوں کو شریعت نے جو آزادی دے رکھی ہے اس کو سلب یا محدود کرے؟ اور اس کی کیا انہماک ہے کہ جس حق کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کے اندر محصور کیا تھا وہ اس ضابطہ کے اندر محفوظ بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک امر کا فیصلہ اگر براہ راست کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جاتا تو کچھ اور ہوتا اور اگر اس ضابطہ کی روشنی میں کیا جائے تو اس سے بالکل ہی مختلف ہو۔ پھر یہ کتاب و سنت سے انحراف ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

دوسرا شبہ یہ ہے کہ تدوین قانون کا کام لازماً چند افراد پر مشتمل کوئی کمیٹی کرے گی۔ یہ کمیٹی اپنے اجتہاد سے اسلامی فقہ کے وسیع و خیر میں سے انتخاب کر کے اسلامی قانون کی تدوین کرے گی۔ اور پھر یہی مدون ضابطہ ملک کا قانون بنے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی کسی محدود کمیٹی کا مرتب کردہ ضابطہ اسلامی شریعت کا قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور وہ نہ چنانچہ نفوس کا اجتماع ایک دوسرے ملک کے مسلمانوں پر مستلک کیا جاسکتا ہے؟ کیا اسلامی شریعت میں اس کے جواز کے لئے کوئی گنجائش موجود ہے؟

تیسرا شبہ یہ ہے کہ جس ملک کے اندر مختلف فقہی مذاہب کے پیروں کو رہے ہوں۔ وہ اس قسم کے کسی ضابطہ پر کس طرح مطمئن ہوں گے؟ وہ اس بات پر تو مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ان ملک کی عدالتیں، معاملات کے فیصلے کتاب و سنت کی روشنی میں کریں۔ کیونکہ کتاب و سنت ان سب کے درمیان مشترک ہے۔ لیکن ان کے لئے کسی خاص ضابطہ قانون پر مطمئن ہونا نہایت مشکل ہے۔ اس صورت میں وہ بجا طور پر یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ ان کے اوپر کوئی ایسی فقہ لاء جائے گی جس کے کچھ حصہ یا بڑے حصہ کو وہ سرے سے صحیح ہی تسلیم نہ کرتے ہوں۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کو مدون کرنے کی مثال نہ تو صدر اول میں ملتی ہے اور نہ بعد کے ادوار میں ہی اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ پھر ایک ایسی بدعت کا ارتکاب کیوں کیا جائے۔ جس کے

جو ان کی دلیل فراہم کرنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے؟

یہ مختلف قسم کے اعتراضات و شبہات ہیں جو قانون اسلامی کے مخالفین کی طرف سے بھی پیش کئے جاتے ہیں اور اس کے موافقین کی طرف سے بھی سامنے لائے جاتے ہیں۔ مخالفین کا منشا تو ان اعتراضات سے یہ ہے کہ وہ دوسرے سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش ہی کو ناکام بنا دینا چاہتے ہیں۔ موافقین یہ تو نہیں چاہتے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں روڑے اٹکائیں لیکن قانون اسلامی کی تدوین پر ان کو جو اعتراضات ہیں وہ بجائے خود ایسے ہیں کہ بہتوں کے ذہن میں ان سے الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان سے اسلامی قانون کے مخالفین ڈاکو اٹھاسکتے ہیں۔ اس لئے ہم ان تمام شبہات کو یہاں تفصیل کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے اعتراض کا جواب [جو لوگ اسلامی قانون کے مدد و صورت میں موجود نہ ہوتے کے سبب سے اس کے نفاذ ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں اور اس بنا پر موجودہ غیر اسلامی ضابطوں ہی کے جاری رہنے کو ترجیح دیتے ہیں دو مدد و غیر مدد و قانون کے فرق سے بالکل ناواقف ہیں اس ناواقفیت کے سبب سے وہ اس ضابطہ فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر ایک قوم کے پاس اس کا قانون مدد و شکل میں موجود نہیں ہے تو اس کے لئے اپنے قصور و قانون کے مطابق اپنے نظام عدالت کو چلانا ہی ناممکن ہے۔ اور جب ان کے نزدیک یہ ناممکن ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں پھر واحد چارہ کار ایسی قوم کے لئے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جس قانون کو بھی اختیار کئے ہوئے ہے اسی کو چپ چاپ اختیار کئے ہوئے رہے کیونکہ کسی نہ کسی قانون کا رواج ہو نا لاقانونیت کی زندگی سے بہر حال بہتر ہے۔ اگرچہ وہ قانون خدا کے بجائے شیطان ہی کا بنایا ہوا ہو۔

ان معترضین کو شاید یہ نہیں ہے کہ مدد و قوانین کا رواج دنیا میں کب سے ہوا ہے۔ یہ غریب سمجھتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ اپنے عدالتی نظام کو مدد و قوانین ہی کی مدد سے چلاتی رہی ہے۔ اگر عدالتوں کے لئے مرتب احکام و قوانین کے ضابطے نہ ہوں تو پھر تو عدالتیں کوئی کام کر سکتی ہیں اور نہ عدل و انصاف قائم رکھنے کیلئے کوئی ممکن صورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ خیال محض حقیقت حال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ وہی جو دنیا میں

قانون کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں اور ہر ایک مدرستہ، ایک نیا کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کر چکے ہیں بہت عرصے تک کسی مدون قانون سے بالکل نا آشنا ہے ان کی عدالتیں صرف عرف و رواج پر معاملات کے فیصلے کرتی رہیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے تک یورپ مدون قوانین سے تقریباً نا آشنا رہا۔ سب سے پہلا شخص نیپولین ہے جس نے تدوین قانون کی طرف توجہ کی اور اس نے ۱۸۰۴ء میں مشہور قانون نیپولین کا لفظ کیا جس کو یورپ میں تدوین قانون کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں نیپولین ہی کے مدون کرائے ہوئے ضابطہ کو تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ اپنایا گیا۔ اور اس آخری دور میں آکراہنی ۱۹۲۶ء میں ترکوں نے جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے اس قانون کو اپنایا۔

اس سے زیادہ دل چسپ سیتھمت ہے کہ دنیا کے دو بڑے ملک جو آج تہذیب جدید کے امام سمجھے جاتے ہیں، یعنی انگلستان اور امریکہ دو انیسویں صدی کی اس تحریک تدوین سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے بلکہ بدستور اپنے اسی عرف و رواج والے طریقہ پر قائم ہیں جو ان کے ہاں قدیم سے جاری ہے۔ اسی کے مطابق ان کی عدالتیں سارے معاملات کے فیصلے کرتی ہیں اور ان کا کام بے روک ٹوک جاری ہے۔ ان کے سامنے کوئی مدون ضابطہ قانون نہیں ہے۔

کیا اس صورت حال کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کی عدالتیں بالکل من مانے فیصلے صادر کرتی ہیں اور ججوں کی خواہشات کے سوا ہاں کوئی اصول انصاف نہیں ہے؟ یا ان ملکوں کی عدالتوں کے فیصلوں میں ہم رنگی اور یکسانی کے بجائے انتشار ہے؟ یا ان ملکوں کی عدالتیں جو فیصلے کرتی ہیں وہ ان قانونی تصورات کے مطابق نہیں ہوتے جو ان ملکوں میں پائے جاتے ہیں؟ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے تو وہ ان ملکوں کی عدالتوں کے طریقہ کار اور ان کے طریقہ عدل و انصاف سے بالکل ناواقف ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان ملکوں میں اس طرح کے مدون قانونی ضابطے نہیں ہیں جس طرح کے مدون ضابطے یورپ کے دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں

کہ ان ملکوں کی عدالتوں کو من مانے فیصلے کرنے کے لئے بالکل چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ جس طرح وہ برے ملکوں کی عدالتیں اپنے مدون ضابطوں کی پابندی کرتی ہیں اسی طرح امریکہ اور انگلستان کی عدالتیں اپنے پچھلے فیصلوں اور نظائر **Precedent** کی پابندی کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی عدالتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بالاتر عدالتوں کے فیصلوں اور نظائر کی پابند رہیں۔ اور بالائی عدالتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے سابق فیصلوں اور نظائر کی پابندی کریں۔ اس طرح کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں اور امریکیوں کے پاس کوئی مدون قانون نہیں ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ان کے ہاں عدالتی نظام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان نظائر نے کسی طور پر نہ بھی لیکن فی الحقیقت ان کے قانون کو مدون کر دیا ہے۔ ان کی موجودگی میں فیصلہ کو اہمیت ہے۔ اور عدالتوں کے لیے ان کے دائرہ سے باہر نکل کر کوئی من مانا اجتہاد کر ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہ گیا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے ہمس درواج کا بڑا حصہ عدالتی فیصلوں کی راہ سے نظائر کی حیثیت اور پھر اس راستہ سے ملک کے قانون کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

اگر انگلستان اور امریکہ میں یہ صورت چل سکتی ہے اور آج تک چل رہی ہے تو اسلامی قانون محض اس بنا پر کہ وہ مدون صورت میں موجود نہیں ہے کیوں نہیں چل سکتا؟ اور اگر اس کو اختیار کیا جائے تو عدالتیں من مانے فیصلے کرنے کے لیے کیوں آزاد ہو جائیں گی؟ شرخص جانتا ہے کہ اسلامی قانون کے چند اصول بالکل قطعی ہیں جن کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے مثلاً یہ کہ کوئی فیصلہ کتاب مذت کے منصوص کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی فیصلہ اجماع کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح یہ بات بھی امت مسلمہ ہے کہ کوئی اجتہاد ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان اصولوں کی پوری پابندی کی جائے اور اتباع کتاب و سنت اور اتباع شریعت کا وہ جذبہ ججوں کے اندر موجود ہو جو اسلامی عدالتوں کے ججوں میں ہونا چاہیئے اور ان کے اندر شریعت کا وہ علم بھی موجود ہو جو اسلامی قضا کے قرائن کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے تو محض اس وجہ سے کہ اسلامی قانون مدون صورت میں موجود نہیں ہے کہوں ہماری عدالتیں ہمارے اسلامی دستور قانون کے مطابق ہمارے

مسائل کے فیصلہ نہیں کر سکیں گی؛ اور کیوں یہ اندیشہ کیا جائے کہ ان کے فیصلے بالکل من مانتے ہونے لگیں گے؟ اگر محض عرف و رواج کو اساس اور نظر کو رہنما بنا کر انگلستان اور امریکہ کی عدالتوں کو مطلق العنانی سے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ تو اس سے بدتر جہاں اقرب یہ بات ہے کہ کتاب و سنت کے مخصوص آثار مجتہدین کے اجتہادات اور ان کے مسئلہ اصول اجتہاد کا پابند بنا کر اسلامی عدالتوں کو قہریم کی مطلق العنانی سے محفوظ کیا جاسکے اور بغیر کسی مدون قانون کی موجودگی کے ملک کے نظام عدالت کو اسلامی تصور کے مطابق چلایا جاسکے۔ اگر اس میں حقوڑی بہت خرابیاں پیدا ہوں گی تو یہ اسی طرح کی خرابیاں ہوں گی جن سے کوئی نظام بھی پاک نہیں رکھا جاسکتا قاضی شریعہ کو حضرت عمرؓ نے جو ہدایات دی تھیں ان میں جہاں ان کو کتاب و سنت اور اجتہاد سے رہنمائی حاصل کرنے کی ہدایات فرمائی تھیں وہاں ان کو یہ تاکید بھی کی تھی کہ جس چیز کے بارے میں اگلوں کا اجتہاد موجود ہو اس میں کسی نئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہی پابندیاں آج بھی ملحوظ رکھی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلامی شریعت پر ایمان رکھنے والے قاضی اور جج محض اس وجہ سے شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے نہ کر سکیں کہ ان کے سامنے کوئی مدون ضابطہ موجود نہیں ہے جو ان کو حدود و شرع کے اندر محدود رکھے۔

یہ ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو اسلامی قانون کے مدون شکل میں موجود نہ ہونے کے سبب سے ملک کے اندر اس کے اجراء و نفاذ میں کوہِ سرے سے ناممکن سمجھتے ہیں۔ اب ہم ان لوگوں کے شبہات سے بحث کریں گے جو سرے سے قانون کی تدوین ہی کو ایک غیر اسلامی فعل سمجھتے ہیں۔ تدوین قانون کے مخالفین جو لوگ سرے سے قانون اسلامی کی تدوین ہی کے مخالف ہیں ان کا سب کے شبہات کا ازالہ سے بڑا شبہ یہ ہے کہ اس طرح اسلامی قانون کی وسعت جو ایک بہت بڑی برکت ہے، ایک معین ضابطہ کے اندر تنگ اور محدود ہو کر رہ جائے گی اور عدالتیں مجبور ہوں گی کہ معاملات کے فیصلے اسی معین ضابطے کی روشنی میں کریں اگرچہ حق ان کو اس ضابطے سے باہر نظر آ رہا ہو۔

یہ شبہ فی الواقع اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں لانا عدالتوں کو ایک معین ٹوکر کی پابندی کرنی پڑے گی اور ہماری عدالتوں کو فیصلہ اور اجتہاد کی وہ آزادی حاصل نہیں رہے گی جو حضرت معاویہؓ نے

اور قاضی شریح کی عدالتوں کو حاصل تھی لیکن جہاں اس میں یہ ایک پہلو طبیعت میں خلش پیدا کرنے والا ہے۔ ہاں اس میں بعض دوسرے پہلو اطمینان پیدا کرنے والے بھی ہیں اور چونکہ اطمینان پیدا کرنے والے پہلو خواہش پیدا کرنے والے پہلوؤں کے مقابل میں زیادہ ہیں اس لئے اجماع شریعت اور پیروی حق کے نقطہ نظر سے اسی کو اختیار کرنا بہتر ہے۔

سب سے پہلے تو اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ طبیعت اسلامی کی وسعت اگر نیکو برکات ہے تو اس پہلو سے نیکو برکت ہے۔ جسے کہ اس میں رشتائے الہی کی تلاش کے لئے ایک وسیع میدان ملتا ہے اور امت کے اختلافات کے اندر سے ایک شخص کے لئے سہل اور اقرب الی الصواب راہ معین کر دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کام بظاہر جتن سہل نظر آتا ہے اتنا سہل نہیں ہے۔ اس کا ثبوت برکت ہونا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے ایک۔ یہ کہ آدمی کا علم وسیع ہو اور اس کا مزاج شریعت اسلامی سے ایسی گہری مناسبت رکھنے والا ہو کہ وہ اس وسعت اور کثرت اقوال کے اندر لکھو کر نہ رہ جائے بلکہ حق و صواب کے پہلو کو معین کر سکے۔ دوسری کہ اس کا اخلاقی رتبہ اتنا بلند ہو کہ حق کے سوا کوئی دوسری چیز اس کو اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔ اگر یہ دونوں باتیں موجود نہ ہوں تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ یہ وسعت وسعت کے بجائے اس کے بے حیوانی و پریشانی کا باعث بن جائے اور یہ اختلاف اقوال و آراء تلاش حق کے بجائے جبر، مٹی باطل کے لیے ایک اور کام دینے لگے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ ایک صالح معاشرہ اور ایک صحیح نظام تعلیم آج بھی بہتر سے بہتر آدمی تیار کر سکتا ہے۔ لیکن بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کی خوبیوں اور برکتوں کو از سر نو پیدا کر دینا ناممکن ہے۔ اس زمانہ میں نہ شریعت کے ساتھ مزاجوں کو وہ مناسبت ہی ہو سکتی ہے جو ان کے عہد مبارک کے لوگوں کو تھی اور نہ آج اس اعلیٰ اخلاق ہی کو پیدا کیا جاسکتا ہے جو اس زمانہ میں صرف خاص خاص افراد میں نہیں بلکہ ایک بہت بڑے طبقے میں موجود تھا اس وجہ سے یہ خیال آج کے قاضی بھی اسی طرح پیش آنے والے حقائق میں حق کو معین کر سکیں گے جس طرح حضرت امیر المومنین اور قاضی شریح کر لیتے تھے ایک غلط خیال ہے۔

پس قانون کو مدون کرنے سے مقصد شریعت کی وسعت کو تنگ کرنا اور تلاش حق کے مواقع کو ضائع کرنا نہیں ہے بلکہ علم و اخلاق کے زوال کی عام آفت کے سبب سے شریعت کی تنفیذ کے کام کو سہل بنانا ہے۔ غور کیجئے تو یہ بعینہ وہی مقصد ہے جو اسلامی شریعت کی وسعت کے اندر مضمر ہے۔ اسلامی شریعت کی وسعت اس کے نفاذ کے کام کو سہل بناتی ہے بشرطیکہ اس کی تنفیذ کرنے والے اعلیٰ علم اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوں۔ اگر ان دونوں چیزوں میں کمی ہو تو پھر شریعت کی تنفیذ کے نقطہ نظر سے آسان رہا ہی ہے کہ قانون کو مدون کر کے اس کی وسعتوں کو سمیٹ دیا جائے تاکہ اس کو عملی زندگی پر منطبق کرنے والوں کو زیادہ الجھنیں نہ پیش آئیں اور وہ مختلف قسم کی ترغیبات کے شکار نہ ہوں۔

اتباع حق کے نقطہ نظر سے بھی غور کیجئے تو یہی صورت زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ اس صورت میں اس کا امکان ہے کہ کوئی قاضی یہ محسوس کرے کہ ایک خاص معاملہ میں مدون قانون شریعت کے حقیقی منشا سے کچھ مختلف ہے۔ اور اس کو اس مدون قانون کی پابندی کے سبب سے ایک ایسا فیصلہ کرنا پڑے گا ہے جو اس کے خیال میں منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ لیکن اسے سوچنا چاہیے کہ یہ اس کی ایک انفرادی رائے ہے جو اس مدون ضابطہ کے مقابل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جس پر وقت کے ادب و باب حل و عقد کا اجماع ہے یا کم سے کم ان کی اکثریت اس کے شریعت سے اوفق ہونے پر مطمئن ہے۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ تدوین قانون کا کام بہر حال ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں انجام پائیگا اسی کا انتخاب و اجتہاد ہوگا جس کو اس کام میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگی۔ تو کیا ایک چھوٹی سی جماعت کے مدون کئے ہوئے ضابطہ کو مسلمانوں کی ایک پوری قوم پر بلا امتیاز فرقہ و مذہب نافذ کر دینا از روئے شریعت صحیح ہوگا؟

یہ شبہ بھی بظاہر اپنے اندر ابھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شبہ صرف آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تدوین قانون کے خلاف پیش کیا جا چکا ہے۔ اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی اعتراض کے بنا پر تدوین قانون کی تجویزیں بعض مرتبہ رد بھی ہوئی ہیں۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور ادیب ابن مقفع دمتوفی ۷۲۳ھ مترجم کلیلہ و دمنہ نے مسلمانوں

کے فقہی اختلافات سے متاثر ہو کر عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے سامنے قانون کو مدون کرنے کی ایک تجویز رکھی تھی۔ لیکن اسی شبہ کی بنا پر جو اور پرند کو رہنوا ہے اس وقت کے علماء اور فقہاء اور ارباب کارنے ابن مقفع کی تجویز مسترد کر دی تھی۔

ہم یہاں ابن مقفع کی اصل تجویز اور اس کے متعلق علماء و فقہاء کا رد عمل نقل کرتے ہیں تاکہ زیر بحث مشہد کا قابل توجہ پہلو بالکل سامنے آجائے۔

ابن مقفع نے جو تجویز پیش کی تھی اس کا ضروری حصہ خود اس کے الفاظ میں یہ ہے۔
 ”اور ان اسلامی ممالک سے متعلق امیر المومنین کو جس مسئلہ پر خاص طور پر غور کرنا ہے وہ یہ فقہی اختلافات کا مسئلہ ہے۔ جواب اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل اگر امیر المومنین پسند فرمائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ امیر المومنین ایک حکم جاری فرمائیں کہ تمام احکام اور فیصلے ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے امیر المومنین کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔ اور ساتھ ہی ہر گروہ اپنے اپنے عقلی و نقلی دلائل بھی، جو وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں اپنے پاس رکھتا ہے پیش کر دے پھر امیر المومنین اس پر سے ذخیرہ پر نظر ڈال کر ہر معاملہ میں اپنی رائے ظاہر فرمادیں اور پھر عدالتوں کو اس کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دیں۔ اس طرح وہ منتشر احکام اور فیصلے جو رطب و یابس ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل ہیں بالکل مدون ضابطہ کی شکل اختیار کر لیں گے اور غلط چیزوں سے یہ مجموعہ بالکل پاک ہو گا اس طرح توقع ہے کہ تمام بلاد اسلامیہ ایک ہی ضابطہ قانون کے تحت آجائیں گے اور اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی رائے اور فیصلہ پر تمام امت کو متفق کر دے گا۔“

یہ ابن مقفع کی تجویز تھی لیکن یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی اور اس کے کامیاب نہ ہو سکنے کی جو وجوہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ۔

ن کان الباعث علی الخوف الفقہاء	ن کے کامیاب نہ ہونے کا سبب یہ ہوا کہ وقت کے
أولی الأمر من ارتکاب الخطأ فی اجتہادہم	علماء اور ارباب کار اس بات سے غور نہ کیا کہ عباد اور
فی شریعتہ حنیفیۃ کالشریعتہ الاسلامیۃ	اسلامی شریعت جیسی الہی شریعت میں اجتہاد کی غلطیاں

اباؤہم ان یتحملوا تبعۃ اجبار الناس علی تعلیمہم
 کو بیٹھیں۔ یہ سترہ اس بات کے چلنے تیار نہ ہوئے کہ
 لوگوں کو اپنی تقلید پر مجبور کرنے کی ذمہ داری اٹھائیں۔

اسی ابو جعفر منصور کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ یہ جب ۸۴۸ء میں حج کے لیے گیا تو اس نے امام
 مالکؒ سے درخواست کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ تمام مسلمانوں کو امام موصوف کی فقہ پر مجتمع ہونے
 کے لیے تمام مالک اسلام میں حکم جاری کر دے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہیں
 فرمایا اور کہا کہ:-

ان کل قوم سلفاً وائمة فان راى امیر المؤمنین
 ہر گروہ کے اسلاف اور ائمہ الگ الگ ہیں۔ اس
 لئے اگر امیر المؤمنین ان کو موجودہ حال ہی پر چھوڑ دیں تو
 یہ بہتر ہے

ابو جعفر امام مالکؒ کے اس جواب کے بعد اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن اس خیال پر وہ برابر
 قائم رہا کہ امام مالکؒ کے ہاتھوں اسلامی قانون مدون ہو جائے۔ چنانچہ ۸۴۳ء میں جب وہ پھر حج کے
 لئے گیا تو اس نے اپنی سابق تجویز امام صاحب کے سامنے نہایت تفصیل اور زور و قوت کے ساتھ
 رکھی۔ اور تدوین قانون سے متعلق اس نے اپنا نقطہ نظر بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں امام صاحب کے
 سامنے پیش کر دیا۔

”اے ابو عبد اللہ! امام مالکؒ کی کیفیت ہے، آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجئے اور اس کو الگ الگ
 ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیئے۔ عبد اللہ بن عمرؓ کے تشدوات، عبد اللہ بن عباسؓ کی نصحتوں
 اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجئے جو خیر الامم و اولیائہم
 کے اصول پر مبنی ہو اور جراثیم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو اگر آپ نے یہ غفلت
 انجام دے دی تو ہم انشاء اللہ آپ کی فقہ پر مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے۔ اور اس کو تمام مملکت کے
 اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ اس کی خلافت و رزی نہ کی جائے؟“

کہا جاتا ہے کہ امام مالکؒ نے اس کی اسی خواہش کو پیش نظر رکھ کر موطا مرتب کی لیکن وہ اس

بات پر راضی نہ ہونے کے موطا کو پوری مملکت کے لئے اسلامی قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہی خواہش اپنے زمانہ میں ہارون الرشید نے بھی امام صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی خواہش بھی مسترد کر دی۔

یہ تاریخی واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ جہاں تک قانون اسلامی کی تدوین کا تعلق ہے اس کی ضرورت پوری شدت کے ساتھ عباسیوں کے زمانہ ہی میں محسوس کی گئی تھی۔ لیکن نہ تو اس جہد کے عام علمائے اس کی ذمہ داری اٹھانا پسند کیا اور نہ امام مالک جیسے جلیل القدر امام نے اس کو پسند فرمایا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس پیر کے امام مالک جیسے جلیل القدر امام نے خلیفہ وقت کے اتنے شدید اصرار کے باوجود پسند نہیں فرمایا آخر آج اس کو کس دلیل کی بنا پر مستحسن ٹھہرایا جا رہا ہے۔

ہمارے نزدیک ابن مقفع کی تجویز کی علماء کی طرف سے جو مخالفت کی گئی یا ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید کی تجویزوں کو جو امام مالک نے نہیں مانا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ تدوین قانون کا کام شریعت میں کوئی ناپسندیدہ کام ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں تجویزیں بالکل غلط صحت میں پیش کی گئی تھیں۔ اگر یہ تجویزیں جس شکل میں پیش ہوئی تھیں اسی شکل میں عملی جامہ پہن کر نافذ ہو گئی ہوتیں تو اس میں فہرشت نہیں ہے کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا بلکہ ملت اسلامیہ پر یک شدید فتنہ میں مبتلا ہو جاتی۔ اس عہد کے حالات کچھ ایسے تھے کہ کوشش کے بعد بھی اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ یہ تجویزیں صحیح صورت میں بروئے کار آسکتیں اس لئے جو کچھ ہوا بہتر نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے۔ جنہوں نے حسن تدبیر سے کام لے کر اس فتنے کو دبا دیا اور ایک غلط نظیر قائم نہ ہونے پائی۔

ابن مقفع نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں صریح غلطی یہ تھی کہ اس سے تصویب و تردید اور اجتہاد و انتخاب کا پورا حق ابو جعفر منصور کو دے دیا تھا۔ وہ جس بات پر صناد کہ دیتا وہ شریعت کا قانون بن جاتی اور جس بات کو رد کر دیتا وہ شریعت سے خارج ہو جاتی۔ ابو جعفر منصور علم و تقویٰ کے اعتبار سے نہ تو اس ذمہ داری کا اہل ہی تھا اور نہ شریعت نے کسی ایک شخص کو یہ حق ہی بخشا ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے شریعت بنائے اور جس چیز کو چاہے شریعت سے خارج کر دے۔ یہ کام امت کے ارباب حل و عقد اور اصحاب تفسیر و اجتہاد کے مل کر کرنے کا تھا۔ اور وہی از روئے شرع اس کے انجام دینے کے مجاز تھے۔ لیکن ابو جعفر منصور

بیسے مستبد کے آگے ذوا بن مقفیع ہی ایک اسمبلی یا کونسل کے قیام کی تجویز لانے کی جرأت کر سکتا تھا۔ اور نہ وقت کے علماء ہی یہ توقع کر سکتے تھے کہ وہ ابو جعفر منصور کو یہ شکل تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے سلامتی اس میں دیکھی ہوگی کہ کسی طرح یہ بات ٹل جائے چنانچہ یہ کہہ کر انہوں نے اس تجویز سے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ اجتہاد بہت بڑی ذمہ داری ہے اور ہم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنا اجتہاد دوسروں پر لازم کریں۔

اسی طرح ابو جعفر منصور نے امام مالک کے سامنے جو تجویز رکھی تھی وہ بھی بالکل غلط تھی اس صورت میں اجتہاد و انتخاب کی تمام ذمہ داری تنہا امام صاحب پر عائد ہوتی تھی۔ وہ جس شکل میں قانون کو مدون کر دیتے خلیفہ کے حکم سے وہ مدون قانون پوری مملکت میں جاری ہو جاتا اور اس کے سارے عذاب و ثواب کے ذمہ دار خلق اور خالق کے نزدیک تنہا امام صاحب ہوتے۔ بھلا اتنی بڑی ذمہ داری امام صاحب اپنے کندھوں پر کس طرح لے سکتے تھے؟ اس کی صحیح شکل از روئے شریعت یہ تھی کہ ملک کے اہل علم و فقہ اجتماعی طور پر مل کر اس قانون کو مدون کرتے اور پھر ملک کے ارباب حل و عقد اپنی تصدیق و تائید سے اس کو جاری و نافذ کرتے۔ اگر یہ شکل موجود ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ امام صاحب اس ذمہ داری سے کتراتے لیکن نہ تو ارباب حل و عقد پر مشتمل کوئی شور نے موجود تھی نہ ارباب فقہ و اجتہاد کی کوئی تنظیم ہی موجود تھی جو شرعی امور میں کوئی رائے دے سکتی اور نہ خود خلیفہ صاحب علم اور صاحب فقہ ہی تھا۔ تو ایسی شکل میں امام صاحب یہ کس طرح کر سکتے تھے کہ وہ صرف اپنی ذمہ داری پر قانون مدون کر کے دے دیں کہ ابو جعفر منصور اپنے اقتدار کے بل پر مسلمانوں پر اس کو مسلط کر دے؟ اس لئے امام نے اس کے بار بار کے اصرار کے باوجود اس سخت سے معافی چاہی۔

بہر حال ابن مقفیع کی تجویز کے رد ہوتے یا امام مالک صاحب کے تدوین قانون کے کام پر راضی نہ ہوتے کی وجہ یہ ہیں کہ فی نفسہ یہ کام شریعت کی رو سے ناجائز تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام سے عطا ہونے والی عزت و شرف اور مصلحتیں امام مالک کے لئے تھیں۔ امام مالک نے اسے اسی طرح عراق اور مالک مشرق میں امام ابو حنیفہ، شام میں لوزاعی اور مصر میں لیبث بن سعد کے مدد سے فکر کا علیہ تھا۔ اس صورت میں خلیفہ کو وقت کے ایسے ایسے جائز ہو سکتا تھا کہ دوسرے مذاہب فکر کو دبا کر زیرِ ستی امام مالک کی فکر کو ماری مملکت کا قانون بنانا اس نے ہوتی تو امام مالک کی نصیحتیں نہ کر لیا

کے کرنے کا ایک خاص ضابطہ ہے جس کا اہتمام ضروری ہے۔ اس ضابطے سے منحرف ہو کر اس کام کو کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے جس کے لئے کوئی خدا ترس آدمی تیار نہیں ہو سکتا چونکہ بظاہر اس کا امکان نہیں تھا کہ یہ کام اپنے ضابطے کے مطابق ہو سکے گا اس لئے نہ تو حضرت امام مالکؒ نے ابو جعفر منصور کی تجویز قبول فرمائی اور نہ علما نے ابن مقفع کی تجویز کی تائید فرمائی۔ یہی یہ بات کہ یہ ضابطہ کیا ہے تو یہ بات آگے کے مباحث سے آپ سے آپ واضح ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرا شبہ بالعموم اقلیت والے فقہی مذاہب کے پیروں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ مدون قانون لازماً کسی ایک فقہ پر مبنی ہو گا اور ناگزیر ہے کہ یہ فقہ اس گروہ کی ہو جو اس ملک کے اندر اکثریت رکھتا ہے اس سے ان کو بجا طور پر یہ ڈر پیدا ہوتا ہے کہ ان کو ایک ایسے قانون کی اطاعت کرنی پڑے گی جو ان کی اپنی فقہ پر مبنی نہیں ہو گا۔

اس شبہ کو دو باتوں سے تقریباً پختہ ہے ایک تہ یہ کہ عموماً تدوین قانون کا رجحان الگ الگ فرقوں اور گروہوں کی آزادی کے منافی خیال کیا گیا ہے چنانچہ امریکہ اور انگلستان میں تدوین قانون کی تحریک کے زور نہ پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہاں مختلف فرقے اور گروہ موجود ہیں جو اس بات کو ترجیح دیتے رہے ہیں کہ قانون کو تدوین کی جگہ بند میں لانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو عرف و رواج پر باقی رہنے دیا جائے۔ اس میں ہر فرقہ اپنے لئے فی الجملہ آزادی محسوس کرتا ہے ایسی طرح ہمارے ہاں بھی قانون کو مدون کرنے کے بجائے اگر اس کو کتاب و سنت اور اجماع پر چھوڑ دیا جائے تو خیال ہے کہ تدوین کے مقابل میں اس صورت کو اقلیت والے فقہی مذاہب زیادہ پسند کریں گے۔

دوسری بات اس کی تائید میں یہ کہی جاسکتی ہے کہ اب تک تدوین قانون کی جو مثالیں مسلمانوں کے یہاں ملتی ہیں وہ سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ ملک کی اکثریت کا جو فقہی مذہب رہا ہے اسی مذہب کے مطابق قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ نہیں ہوا کہ کتاب و سنت اور اجماع کو اساس قرار دے کر اس بات کی کوشش کی جاتی کہ فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ میں سے وہ مسائل اخذ کر لیے جاتے جو کتاب و سنت سے زیادہ اذوق نظر آتے ہیں۔ اس بنا پر بہتوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آج بھی

تدوین قانون کی نوبت آئی تو یہی ہوگا۔

ان شبہات اور اندیشوں سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ پہنی یہ کہ جہاں تک اہل سنت کے مختلف فقہی مذاہب کا تعلق ہے ان کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اصول کا اختلاف نہیں ہے بلکہ محض تاویل اور اجتہاد کا اختلاف ہے۔ تاویل اور اجتہاد کا اختلاف کوئی ایمان اور عقیدے کا معاملہ نہیں ہوا کرتا کہ اس کے خلاف کوئی بات اختیار ہی نہ کی جاسکے۔ بلکہ یہاں سوال صرف ترجیح کا ہوتا ہے۔ آپ کسی پہلو کو ترجیح دیتے ہیں دوسرا کسی پہلو کو ترجیح دیتا ہے۔ محض اتنی سی بات کہ کسی گروہ کا اپنی بات پر اڑتا اور دوسری اس حد تک کہ اس کے سبب سے نفس اسلامی قانون کے نفاذ ہی میں لوکاوٹ پیدا ہو جائے۔ کسی طرح بھی قرین عقل و دیانت نہیں ہے۔ اہل سنت اور شیعہ حضرات کے اختلافات تو وہ فرق فقہ تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ عقائد اور دستوری مسائل تک بھی ان کی زد میں آگئے ہیں۔ اب اگر مسلمان ملکوں میں اسلامی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہونی ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ اصول اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جہاں شیعوں کی اکثریت ہے وہاں دستور اور ملکی قانون شیعہ مسلک پر بنے اور سنہریوں کو آئینی تحفظات دیے جائیں اور اسی طرح اس کے برعکس۔

دوسری یہ کہ حکومت کا تعلق زیادہ تدوین کے اس حصے سے ہوتا ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ بقیہ چیزیں حکومت سے براہ راست تعلق رکھنے والی نہیں ہوا کرتیں۔ دین کے اس حصے میں اول تو فقہی اختلافات نسبتاً کم ہیں۔ ثانیاً جو مسائل عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں ان میں محض ٹیکنیکل وجوہ پر اگر کوئی شخص اپنی بات کی سچ کرنا چاہے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ اس طرح کے معاملات میں اصلی فیصلہ کن عامل کسی چیز کا عملی پہلو ہوا کرتا ہے۔ عملی زندگی کے تجربات خود انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہیں کہ کسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں میں سے کون سا پہلو اختیار اور ترجیح کے لائق ہے اور اس اشارہ کو مشکل ہی سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ فقہ حنفی کے کچھ مسائل ہیں جن میں متقدمین کا مسلک کچھ اور تھا لیکن متاخرین

سہ : ملاحظہ ہو اسلامی ریاست میں فقہی تعلقات اور ان کا حل "از امین احسن اصلاحی

بنے کچھ اور اختیار کیا۔ ایسے مشائخ جو کم نہیں ہیں کہ متاخرین نے اپنے امام کے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے اماموں کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیے۔ بعض مشائخ ایسی بھی ملتی ہیں کہ جن ملکوں کی عظیم اکثریت شافعی المذہب تھی۔ انہوں نے خود اپنے اختیار سے اپنے پرسنل لار کو فقہ حنفی کے مطابق مدون کرایا اور اس کو نافذ کیا ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلمان زندگی کے معاملات میں تصلب اور تقلید جامد کے رویے پر زیادہ عرصہ تک اصرار ممکن نہیں ہے بلکہ تجربات، خود اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو سوسائٹی ایک مدت دراز تک ریاست کی عملی ذمہ داریوں سے بیگانہ رہی ہے۔ اس کے اندر سے تقلید جامد اور تصلب کو دور ہونے کے لیے کچھ دیر لگے گی اور اس معاملے میں بہر حال صبر سے کام لینا پڑے گا۔

تیسری یہ کہ صحیح تدوین قانون تو اسی وقت ہو سکے گی جبکہ اس تدوین کے ذمہ دار اصحاب کے نقطہ نظر فقہی مسائل میں وسیع ہو۔ اور وہ ایک مذہب کے تمام مسائل کی پیروی پر اصرار کرنے کے بجائے تمام مذاہب فقہیہ سے استفادہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہمارے اہل علم کو ایک آزاد اسٹیٹ کی قانونی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داریاں سنبھالتے ایک عرصہ گزر جائے اور جب تک کہ ہمارے ہاں تعلیم فقہ کا طریقہ نہ بدل جائے اس وقت تک ہمیں اس پر وقت کرنی پڑے گی کہ ہمارے ہاں شرعی قانون جس طرح بھی ہو ایک دفعہ مدون ہو کر رائج ہو جائے۔

۴۔ چوتھا شبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں تدوین قانون کی کوئی قابل ذکر مثال نہیں ملتی اس وجہ سے یہ ایک بالکل نئی بات ہے۔

ہمارے نزدیک اس شبہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہماری تاریخ کے مختلف زمانوں میں قانون اسلامی کو مدون کرنے کی چھوٹی بڑی کوششیں عمل میں آتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے صحابہؓ نے قرآن مجید کو جمع کیا اور حضرت عثمانؓ نے ۳۰ھ میں اس کی نقلیں مختلف اسلامی ملکوں کو بھجوائیں۔ اس کے بعد جب جنت حدیثوں کی صورت میں اور اسلامی قانون کے مختلف ابواب جمع کئے جانے لگے یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابو بکر بن حزمؒ کو باقاعدہ احادیث مدون کرنے کا حکم دیا۔

اس وقت تک فقہی اختلافات بہت زیادہ بڑھے نہیں تھے اس وجہ سے فقہی مسائل کی تدبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جوہی یہ اختلافات بڑھے فوراً ان کی تدبیر کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی چنانچہ ابن مقفع نے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، ابو جعفر منصور کو اس چیز کی طرف توجہ دلائی اور پھر یکے بعد دیگرے ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید نے اس کے لیے حضرت امام مالکؒ پر زور ڈالا اور امام صاحب نے غائباً حبس کرکے پیش نظر رکھ کر موطا لکھی بھی۔ لیکن اس بات کو انہوں نے پسند نہیں فرمایا کہ تنہا ان کے مدون کیے ہوئے قانون کو پورے ملک کا قانون بنا دیا جائے۔ اگر نظام خلافت شہنائی ہوتا اور تدوین قانون کے کام کو صحیح طریقہ پر ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں انجام دلیا گیا ہوتا جو تفقہ اور اجتہاد کے پہلو سے تمام مسلمانوں کے نزدیک معتد ہوتی اور امام صاحب کو یہ اعتماد ہوتا کہ اس کا نفاذ ارباب حل و عقد کی تصویب و تائید سے ہوگا، نہ کہ محض خلیفہ کے حکم سے، تو غائباً یہ کام حضرت امام مالکؒ کی رہنمائی میں ہی زمانہ میں انجام پا گیا ہوتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، اس کو جس شکل میں امام صاحب کے سامنے رکھا گیا تھا وہ شکل ایسی نہ تھی کہ اس کی ذمہ داری وہ اپنے سرے سکتے۔

اس کے بعد تدوین کی ایک نمایاں کوشش گیارہویں صدی ہجری میں سلطان محمد اورنگزیب عالمگیر کے حکم سے عمل میں آئی۔ سلطان موصوف نے علما کی ایک کمیٹی بنائی اور ان کو ایک ایسی کتاب مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جو ایسے فتوؤں پر مشتمل ہو جن پر جید فقہاء نے اتفاق کیا ہو اور جس میں ایسے نواد جمع کیے جائیں جن کو ماہر علماء نے اختیار کیا ہو۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مشہور کتاب فتاوائے عالمگیری کی ترتیب عمل میں آئی۔

یہ کتاب چھ جلدوں میں ایک ضخیم کتاب ہے جس طرح فقہ کی دوسری کتابوں میں عبادات و معاملات کا بیان ہوتا ہے اسی طرح اس کتاب میں بھی عبادات و معاملات کی تفصیل ہے۔ اگرچہ شروع سے اس کتاب کو فقہ حنفی میں ایک نہایت اہم مرجع کی حیثیت حاصل ہے لیکن نہ تو اس کی تدوین اس طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقہ پر اس زمانہ میں قوانین مدون ہوتے ہیں اور نہ باطلہ سرکاری طور پر کبھی ضابطہ قانون کی حیثیت سے اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

اس کے بعد تدوین قانون کی ایک قابل ذکر کوشش دولت عثمانیہ نے کی حکومت نے سات
عدا پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور ان کے سامنے یہ کام رکھا کہ۔

”قضی معاملات پر مشتمل ایک ایسی کتاب تالیف کی جائے جو ضابطہ کی صورت میں منضبط ہو جس سے
قابضہ اٹھانا نہایت آسان ہو۔ جو اختلافات سے پاک ہو۔ جو تمام مختار اقوال پر حاوی ہو جس کی
مراجعت ہر شخص کے لیے آسان ہو“

اس کمیٹی نے تدوین قانون کی ضرورت سے متعلق مہرم سلسلہ بھری (مطابق ۱۸۷۹ء) میں صدر
اعظم عالی پاشا کی خدمت میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں تدوین قانون کی ضرورت مندرجہ ذیل الفاظ
میں ظاہر کی گئی تھی۔

”علم فقہ ایک نیا پیکارا مندر ہے جس کی وسعت کے سبب سے مشکلات کے حل کے لیے ضروری
مسائل کا نکلنا بڑی مہارت اور بڑے ملکہ کا تقاضا کرتا ہے خصوصاً فقہ حنفی کی دستوں کی تو کوئی حد
ہی نہیں رہی ہے۔ اس کے اندر ہر دور میں بڑے بڑے مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے
اس میں بہت سے اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ اور چونکہ فقہ شافعی کی طرح فقہ حنفی کی تفریق نہیں ہو
سکی اس وجہ سے یہ اختلافات جوں کے توں پورے رہ گئے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اختلافات
اور تناقضات کے اندر سے صحیح بات کو مستخرج کر کے نکالنا اور اس کو حالات زمانہ پر منطبق کرنا نہایت
مشکل کام بن گیا ہے۔ علاوہ انہیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جو مسائل رواج اور عادت پر
یعنی ہوتے ہیں وہ زمانہ کے تغیر سے بدلتے بھی رہتے ہیں۔“

مذکورہ بالا مقصد سامنے رکھ کر کمیٹی نے تدوین قانون کا کام شروع کیا جو ۱۲۹۳ ہجری ۱۸۷۶ء ۱۶
میں انجام کو پہنچا اور مجلہ احکام عدلیہ کے نام سے سلطان کی جانب سے اس کے نفاذ کا اعلان ہوا۔
مجلہ الاحکام کی نوعیت سے فی الجملہ آشنا کرنے کے لیے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم مختصراً اس کے بعض
پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کر دیں۔

مجلہ الاحکام کل ۱۸۵۱ دفعات پر مشتمل ہے جو ایک مقدمہ اور ۱۱ ابواب میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقدمہ میں سو دفعات پر جن میں فقہ کی تعریف و تقسیم بیان کرنے کے بعد اس کے کلیات اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اس میں بالترتیب مندرجہ ذیل ابواب آئے ہیں۔

کتاب البیوع۔ کتاب الاجارات۔ کتاب الکفالتہ۔ کتاب الحواتہ۔ کتاب الزین۔ کتاب الامانات۔ کتاب الہیتہ۔ کتاب الغصب والذلت۔ کتاب الحجر والاکراہ۔ کتاب الشفعتہ۔ کتاب الشراکات۔ کتاب الوکالتہ۔ کتاب الصلح والابراء۔ کتاب الاقرار۔ کتاب الدعوی۔ کتاب البیئات والتملیف۔ کتاب القضاء۔

مجھے کا عام ماخذ فقہ حنفی کی مشہور اور متفق علیہ کتابیں ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے کوئی قول منقول ہوئے ہیں تو مجھے میں اس قول کو لیا گیا ہے جو ضروریات زمانہ اور مصلحت عام کے موافق نظر آیا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر نہ صرف امام محمد اور قاضی ابویوسف کے اقوال کو بعض جگہ امام صاحب کے اقوال پر ترجیح دی گئی ہے بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کہیں کہیں متاخرین کے اقوال کو متقدمین کے اقوال پر ترجیح دے دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اقوال اگر مذہب شافعی کے موافق ہوئے ہیں جب بھی ان کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی گئی ہے۔

مجلد کے مذکورہ ابواب پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قنادائے عالمگیری اور فقہ حنفی کی دوسری جامع کتابوں کے برعکس مجھے میں عبادات اور تعزیرات کا حصہ نہیں ہے۔ نیز وہ قوانین بھی اس میں نہیں لیے گئے ہیں جو پرستل لا سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً نکاح، طلاق، نفقہ، نسب، ولایت، وصیت اور پرورش و رضاعت وغیرہ۔ علاوہ انہیں وراثت، فقہ و الفجر اور اوقات وغیرہ کے احکام بھی اس میں نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اس کام کو بتدریج کرنا پسند کیا گیا ہو۔ اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حکومت نے ۱۹۱۴ء میں ایک قانون نکاح و طلاق سے متعلق قانون عائلی کے نام سے جاری کیا۔ اس قانون کی خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ اسلامی فقہ حنفی پر مبنی تھا جس کو سرکاری مذہب ہونے کی حیثیت حاصل تھی لیکن اس میں بہت کچھ دوسری اسلامی فقہوں سے بھی لیا گیا تھا۔ تاکہ اس کو ضروریات زمانہ کے مطابق بنایا جاسکے۔

جس زمانے میں مجلے کی تدوین ہوئی ہے اس زمانہ میں تقریباً تمام عرب ممالک میں تدوین قانون کا رجحان نہایت شدت سے پایا جا رہا تھا اس وجہ سے مجلے کو نہ صرف ترکی میں نافذ کیا گیا بلکہ ان تمام ممالک میں اس کو قبول کر لیا گیا جو ترکوں کے زیر اقتدار تھے۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک یہ ان تمام ملکوں میں نافذ عمل رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ترکی میں اس کو ختم کر کے اس کی جگہ سوئٹزر لینڈ اور جرمنی و اٹلی کے قوانین کو دے دی گئی۔ پھر بتدریج اس کو لبنان اور البانیہ میں ختم کیا گیا۔ لیکن اب بھی فلسطین، عراق، شام اور شرق اردن میں اس کے اثرات کچھ نہ کچھ باقی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں عراق میں بھی ضابطہ دیوانی کو فقہ اسلامی کی بنیادوں پر مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی گئی تھی لیکن اس کی کوششوں کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ اس کمیٹی کے پیش نظر ضابطہ دیوانی کو اس طرح مرتب کرنا تھا کہ اسلام اور عصر حاضر دونوں کے تعلق سے پورے ہو سکیں۔ اس کمیٹی نے مصر کے ایک مشہور ماہر قانون کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور اس نے ۱۹۴۲ء میں اپنا کام پایا بھی کر لیا تھا، لیکن بعد کے مراحل میں کیا صورت پیش آئی اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مصر ابتدا سے شافعی المذہب مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اس وجہ سے دولت اسماعیلیہ کے زمانہ تک وہاں مذہب شافعی کا دور دورہ رہا۔ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ کچھ اسی سے ملتی جلتی حالت وہاں دولت الٰہیہ کے زمانہ میں بھی قائم رہی۔ بدلتے ترکوں کے اقتدار کے بعد وہاں مذہب شافعی کی جگہ عدالتوں میں فقہ حنفی کا دور دورہ ہوا اور ایک حد تک یہی صورت حال وہاں اب بھی باقی ہے۔

قانون کو مدون کرنے کی کوششیں تو مصر میں ترکوں کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکی تھیں لیکن چونکہ ان میں سے کوئی کوشش خالص اسلامی بنیادوں پر عمل میں نہیں آئی ہے اس وجہ سے ان کا ذکر یہاں بے عمل ہو گا۔ صرف ایک کوشش اس مقام پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ حکومت مصر کے حکم سے محمد قدوسی پاشا مرحوم نے مسلمانوں کے پرسنل لا سے متعلق قوانین فقہ حنفی کی بنیاد پر مدون کیے۔ یہ

ضابطہ کل ۷۴۴ دفعات پر مشتمل ہے اور اس میں نکاح، طلاق، نسب، ولایت، ہبہ، میراث اور وصیت وغیرہ کے قوانین جمع کیے گئے ہیں۔ مصری عدالتوں میں اسی ضابطہ کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہو تے ہیں۔ اس دور آخر میں ایک کمیٹی شیخ مراغی مرحوم کی صدارت میں قائم ہوئی تھی جس کے ارکان میں مفتی مصر شیخ عبد المجید سلیم اور مصر کے چیف جسٹس شیخ فتح اللہ سلیمان بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لاء سے متعلق قوانین نئے طریقے پر مرتب کرے اور اس میں کسی ایک متعین فقہ کی تقلید کے بجائے اسلام کے تمام فقہی مذاہب سے فائدہ اٹھائے۔ یہ کمیٹی ہمارے نزدیک صحیح اصول پر ایک صحیح مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن ہمیں اس کے کاموں کی تفصیلات کی بابت کچھ علم نہیں کہ یہ کچھ کام کر سکی یا نہیں اور اگر کر سکی تو کس حد تک اور اس کے نتائج کیا نکلے؟

جس طرح ہمارے یہاں اس وقت حامیان شریعت اور مخالفین شریعت کے درمیان ایک کشمکش سی برپا ہے اسی طرح مصر میں بھی تدوین قانون سے متعلق حامیان شریعت اور مخالفین شریعت میں ایک سخت کشمکش برپا ہے۔ مخالفین شریعت یہ چاہتے ہیں کہ قانون کی تدوین ہو یا قانون کا بنانا، یہ دونوں کام جدید طرز پر شریعت سے بالکل بے نیاز ہو کر کیے جائیں۔ شریعت کو ان چیزوں میں مداخلت کرنے کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ اس کے برعکس حامیان شریعت یہ کہتے ہیں کہ قانون کی تدوین تو بے شبہ نئے طریقوں پر عمل میں آئے، تاکہ ہمارا مدون کیا ہوا ضابطہ نئے عصری تقاضوں کے مطابق ہو، لیکن جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے اس کی اساس سو فیصدی اسلامی شریعت پر ہو، کیونکہ اسلامی شریعت کے سوا کوئی اور شریعت ہمارے قانون کی اساس نہیں بن سکتی۔

لطفت کی بات یہ ہے کہ مصر میں وطنیت کا جذبہ ایک ہی ساتھ ان دونوں رجحانات کی حمایت کر رہا ہے۔ دین کی مخالفت بھی وطنیت ہی کے جذبہ کے تحت ہو رہی ہے اور اس کی تائید میں بھی اب یہی جذبہ زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہی صورت حال ممالک عربہ سے نظر آرہی ہے۔ خلیفہ اہل بیت پاشا نے ترکوں کے بنائے ہوئے مجلہ احکام کو محض اس بنیاد پر رد کر دیا تھا کہ وہ ترکوں کے اثر و اقتدار کی یادگار ہے اس کا قومی تعصب اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ ترکوں کے ہاتھ کیے کسی چیز کو

قبول کرے اگرچہ وہ دین ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس سے منجملہ کوڑ پٹانے کے بجائے شیخ غلوت منیاوی کو رہا کر دیا گیا کہ وہ پتولین کے قانون اور امام مالک کے قانون میں تطبیق دے کر مصر کے لیے ایک نیا ضابطہ تدوین کریں۔ چنانچہ شیخ منیاوی نے محنت شاقہ کر کے ایک ضابطہ تدوین بھی کیا، لیکن مصر کے ہر حدیث سے اس کی مخالفت ہوئی اور مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ غیر ملکی ہے۔ یعنی مخالفت کرنے والوں کی نظر میں اس کی اصلی خرابی یہ نہیں تھی کہ وہ خلاف شریعت ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ ایک غیر ملک سے برآمد کیا گیا ہے۔ انہی شیخ منیاوی کے جواب میں مرحوم قدوسی پاشا نے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ایک ضابطہ حنفی فقہ کی اساس پر تدوین کو کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہماری تمام عصری ضروریات اسلامی شریعت سے پوری ہو سکتی ہیں اس وجہ سے ہمیں کسی غیر ملکی قانون کے منت کش ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت وطنیت کے جذبہ کو مصر میں جس طرح اسلامی شریعت کی حمایت میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ شیخ محمد سلیمان نائب محکمہ شرعیہ، عالیہ، شیخ احمد محمد شاگرد سید محبوب الدین خطیب وغیرہ جیسے علماء کی ان تحریروں سے ہوتا ہے جو انہوں نے غیر اسلامی قوانین کے مقابلہ میں اسلامی شریعت کی حمایت میں لکھی ہیں۔

ان علماء کا اسلامی شریعت کی حمایت میں عام طرز استدلال یہ ہے کہ ہماری وطن پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسلامی شریعت ہی کو اپنی قانون سازی کی اساس قرار دیں، کیونکہ اسلامی شریعت کے مانو دو سرے تمام قوانین ہمارے ملک اور ہماری قوم کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ اسلامی شریعت ہی ہے جو ۱۳ سو سال سے ہمارے ملک پر حکمران رہی ہے۔ اسلامی شریعت ہی ہے جو ہماری وطنی عزت، ہماری زبان، ہمارے مذہب اور ہمارے کلچر کی صدیوں سے محافظ ہے۔ اسی کے اندر وہ خزانے ہیں جو موجودہ تہذیب و تمدن اور موجودہ قومی ترقیوں کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ اسی کے اندر وہ چیز موجود ہے جو ہمیں مغرب کی غلامی سے چھڑا سکتی ہے اور مصر کو تمام مشرق کی امامت کا درجہ دلا سکتی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تہذیبی چیز ہے جو ہمارے عوام اور ہماری حکومت کے درمیان وہ صحیح مفاہمت

اور حقیقی تعاون پیدا کر سکتی ہے جس کے بغیر دنیا میں کوئی قانون سازی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔
 ان تمام تفصیلات سے جو اوپر ہم نے پیش کی ہیں یہ حقیقت ابھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تدوین
 قانون کا تخیل مسلمانوں میں کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ یورپ میں اس تخیل کے جنم لینے سے بہت پہلے
 مسلمانوں کے اندر یہ تخیل پیدا ہوا۔ یورپ میں تدوین قانون کی ابتدا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے پولین سے
 ہوئی ہے، لیکن اسلام میں اس کی ضرورت سب سے پہلے ابو جعفر منصور نے امام مالک کے سامنے
 پیش کی تھی۔ اور یہ تخیل صرف تخیل ہی کے حد تک نہیں رہا بلکہ واقعات کی شہادت سے یہ ثابت ہے
 کہ تاریخ کے تقریباً ہر دور میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام بھی ہوئے۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار
 نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کام اس حد تک نہیں ہو سکا جس حد تک اس کو ہونا چاہیے اور نہ اس طرح
 ہو سکا جس طرح اس کا ہونا مطلوب تھا۔

تدوین قانون کا صحیح طریقہ | اوپر کے مباحث سے جو حقیقت نہایت واضح ہو کر سامنے آئی ہے وہ یہ
 ہے کہ اب تک مسلمانوں نے تدوین کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے پیشتر اس کی نوعیت یہ رہی ہے کہ فقہ
 حنفی کو سامنے رکھ کر اسی کے جھول جھال درست کر کے اس کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس
 کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جہاں یہ کام ہوا ہے وہاں کے حکمران بھی اسی فقہ کے پیرو تھے۔ اور وہاں کے عوام
 کی اکثریت بھی اسی فقہ کی مقلد تھی۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں ناگزیر برعکس اس کام میں فقہ حنفی ہی
 کو ترجیح و تقدم حاصل ہو۔ یہ طریق کار اگرچہ اس پہلو سے صحیح ہے کہ ملک کے عوام کی اکثریت اس سے
 مطمئن ہوتی ہے، لیکن اس میں چند خرابیاں ایسی ہیں جو ناقابل لحاظ نہیں کہی جاسکتیں۔

اس میں پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے اتباع کتاب و سنت کا حق جو ایک مسلمان پر
 سب سے بڑا حق ہے پوری طرح ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اجتہاد میں مسائل
 میں ہم کو کسی متعین فقہ کی تقلید کے بجائے اوقی بالکتاب و السنۃ بات کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اور
 یہ چیز صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم کسی متعین فقہ کی تقلید کے بجائے ہر امر میں یہ دیکھنے کی
 کوشش کریں کہ اس کے بارے میں فقہاء و مجتہدین کے جو اقوال منقول ہیں ان میں سے کتاب و سنت

سے قریب تر قول کون سلسلہ ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے وہ عصری تقاضے کا حقہ پورے نہیں کیے جاسکتے جو تدوین قانون سے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری فقہ اسلامی بحیثیت مجموعی تو بلاشبہ ان تمام اجتماعی و سیاسی اور تمدنی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے جن سے آج ہم دوچار ہیں، لیکن یہ دعویٰ ہم اپنی مختلف فقہوں میں سے کسی ایک مخصوص فقہ کے بارہ میں مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔

چنانچہ غالباً یہی وجہ ہے کہ ترکوں نے جو مجلہ احکام تیار کر لیا وہ زیادہ عرصہ تک عصری تقاضوں کو پورا نہ کر سکا بلکہ بہت جلد اس میں ترمیمات کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس کا بیرونی ہی بدل گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر صرف فقہ حنفی پر مبنی ہونے کے بجائے وہ پوری فقہ اسلامی کو پیش نظر رکھ کر مدون کیا گیا ہوتا تو وہ عصری تقاضوں کے مقابلہ میں نہایت مستحکم ثابت ہوتا اور اگر اس میں کوئی کمی محسوس ہوتی بھی تو بڑی آسانی سے اس کی تلافی فقہ اسلامی کے اندر ہی سے مواد حاصل کر کے کی جاسکتی تھی۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ ملک کے اندر جن مذاہب کے پیرو اقلیت میں ہوتے ہیں وہ اس سے ایک قسم کی بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے تمام گروہوں کے اندر کتابہ و سنت کی حیثیت ایک جہاں کی ہے اس وجہ سے ان دونوں چیزوں کے بارہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ ان پر متفق ہیں۔ اسی طرح وہ کسی ایسے مدون ضابطہ پر بھی آسانی سے متفق ہو سکتے ہیں جو پوری فقہ اسلامی سے اخذ اور کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر مرتب کیا گیا ہو۔ لیکن اگر وہ یہ محسوس کریں کہ کسی خاص گروہ کی فقہ ان کے اوپر لادی جا رہی ہے تو اس چیز سے ان کے اندر بے چینی پیدا ہوگی اور ان کی یہ بے چینی بالکل قدرتی ہوگی۔

ان تمام خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ مدوین قانون اپنے سامنے کسی ایک ہی معین فقہ کو سامنے نہ رکھیں بلکہ پوری فقہ اسلامی کو سامنے رکھ کر ہر اجتہادی مسئلے میں یہ دیکھیں کہ کونسی بات کتاب و سنت کے فحویٰ اور مقصد سے زیادہ لگتی ہوئی ہے، اور جہاں بات اس پہلو سے زیادہ قوی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں اس کا تعلق ہماری مختلف فقہوں میں سے جس فقہ سے بھی ہو۔ باقی ص ۳۴۵ پر